تدبّرِ قرآن

۴۴

الدّخان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

اس سورہ کا قرآنی نام وہی ہے جو سابق سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی اصل مدعا کے اعتبار سے تقریباً وہی ہے جو سابق سورہ کی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں توحید کے دلائل کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں توحید کے دلائل کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ پوری سورہ پر تدبّر کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں قرآن اور رسالت کا اثبات اس پہلو سے ہے کہ قرآن منکرین کو جس انجام کی خبر دے رہا ہے وہ دنیا میں بھی شدنی ہے اور آخرت میں بھی۔ تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے اور یہی عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف، ۸۹) (ان کو نظر انداز کرو اور کہو میرا سلام لو پس یہ عنقریب جان لیں گے) اس سورہ میں اسی تہدید کے دلائل و قرائن کی وضاحت ہے۔ گروپ کی آگے کی سورتوں میں یہ مضمون زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ گروپ کے آخر میں جو مدنی سورتیں ہیں ان میں قریش کے عزل اور اہل ایمان کی نصرت اور ان کے غلبہ کا بالکل قطعی الفاظ میں اعلان فرما دیا گیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۶) قرآن کی عظمت و شان اور اس کے اہتمام نزول کی طرف اشارہ کہ یہ مبارک لیلۃ القدر میں اتارا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام امورِ مصلحت کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ خدائے سمیع و علیم کی رحمت و ربوبیت کے تقاضوں سے ظہور میں آیا ہے جس کے سوا کوئی رب نہیں اور مقصود اس کے اتارنے سے انذار ہے کہ جو لوگ غفلت میں پڑے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں وہ جاگیں اور جو دن آنے والا ہے اس کے لیے تیاری کریں۔ جو لوگ رسول کی صداقت کے لیے یہ شرط ٹھہراتے تھے کہ ان کو عذاب دکھا دیا جائے، ان کو تنبیہ کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد جو ایمان لایا جاتا ہے وہ سود مند نہیں ہوتا۔ اگر عذاب کے آنے میں اس وقت تاخیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عذاب کی دھمکی محض دھمکی ہے۔ اگر اللہ نے یہاں لوگوں کو مہلت دے بھی دی تو اس سے وہ خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں ہو جائیں گے۔ ان کی پکڑ لازماً آخرت میں

ہوگی اور وہ بڑی ہی سخت پکڑ ہوگی۔

(۱۷-۳۳) قریش کی عبرت کے لیے فرعون اور قوم فرعون کے انجام کی مثال۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو انذار کیا لیکن وہ اپنے مال و جاہ کے غرّے میں مبتلا رہے۔ بالآخر اتمامِ حجّت کی مہلت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا۔ ان کے تمام ملک و مال پر دوسرے لوگ قابض ہوگئے اور بنی اسرائیل، جو ان کی غلامی کے شکنجہ میں سسک رہے تھے، غلامی سے چھوٹ کر دنیا کی ایک عظیم قوم بن گئے۔

(۳۴-۵۷) قریش کے تمرّد کے اصل سبب کا بیان کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے ان کو آخرت کا ڈراوا ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تنبیہ کے لیے جزاء و سزا کے عقلی اور تاریخی دلائل کی طرف اجمالی اشارہ اور اس امر کی تفصیل کہ آخرت سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یکساں نہیں ہوگا بلکہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوگا اور یہ بالکل مبنی بر انصاف ہوگا۔ اہلِ کفر اپنی ناشکریوں کی سزا بھگتیں گے اور اہلِ ایمان اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے اور یہی اصل کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر یہ نادان ریجھے ہوئے ہیں۔

(۵۸-۵۹) خاتمۂ سورہ، جس میں اس احسانِ عظیم کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے جو قرآن کو عربی مبین میں نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش اور اہلِ عرب پر فرمایا۔ واضح رہے کہ قرآن کی عظمت کے بیان ہی سے اس سورہ کا آغاز ہوا تھا اور اسی مضمون پر اس کا خاتمہ بھی ہوا ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ ان پر اتمامِ حجت کے لیے اللہ نے اس کتاب کو تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے بھیجا ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقدّر ہے۔ آخری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کے لیے اب اس روزِ بد ہی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ الدُّخَانِ (۴۴)

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ۵۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿١﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿٣﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿٤﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٥﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿٧﴾ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨﴾ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿٩﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٠﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١١﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿١٤﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿١٦﴾

آیات ١-١٦ · مـعٓ · وقف لازم · وقف لازم · وقف لازم

ترجمہ آیات ١-١٦

یہ حٰمٓ ہے۔ قسم ہے واضح کر دینے والی کتاب کی۔ بے شک اس کو ہم نے

ایک مبارک رات میں اتارا ہے، بے شک ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے تھے۔ اس رات میں تمام پرحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے امر سے۔ بے شک ہم رسول بھیجنے والے تھے، خاص تیرے رب کی رحمت سے۔ بے شک سننے جاننے والا وہی ہے۔ اس رب کی رحمت سے جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا خداوند ہے اگر تم یقین کرنے والے بنو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، تمہارا بھی رب اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب۔ ۱-۸

بلکہ وہ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ پس انتظار کرو اس دن کا جس دن آسمان ایک کھلے ہوئے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہوگا۔ وہ دھواں لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے! اے ہمارے رب! ہم سے عذاب دور کر دے، ہم ایمان لانے والے بنے۔ اب ان کے لیے نصیحت پکڑنے کا کہاں موقع باقی رہا! ان کے پاس تو ایک واضح کر دینے والا رسول آچکا تھا تو انھوں نے اس سے منہ موڑا اور کہا کہ یہ تو ایک سکھایا پڑھایا خبطی ہے۔ ہم کچھ وقت کے لیے اس عذاب کو کھول بھی دیں تو تم لوٹ کر وہی کروگے جو کرتے رہے تھے۔ یاد رکھو جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ اس دن ہم پورا بدلہ لے کر رہیں گے! ۹-۱۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے اور یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ ناموں کا اشتراک مطالب کے اشتراک کی دلیل ہوتا ہے چنانچہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں قریش کو تکذیب رسول کے جس انجام کی دھمکی دی ہے اس سورہ میں اسی دھمکی کی تفصیل ہے۔ آگے کی آیات سے اس کی

پوری وضاحت ہو جائے گی۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

'و' یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ عربی میں قسم کا اصل مقصد کسی دعوے پر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقسم علیہ کیا ہے؟ عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا مقسم علیہ بعد والی آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ..... کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ زبان کے قواعد کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں ہے لیکن مجھے اس پر پورا اطمینان نہیں ہے۔ قسم اور مقسم علیہ میں تعلق دلیل اور دعوے کا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کا کتاب مبین ہونا اس بات کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ میرے نزدیک یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ قرینہ اور موقع کلام اس محذوف پر دلیل ہے۔ بربنائے قرینہ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی نظیریں بہت ہیں۔ ایک واضح نظیر سورۂ قٓ میں موجود ہے۔ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ... (۱-۲) (یہ سورۂ قٓ ہے، شاہد ہے قرآنِ بزرگ! بلکہ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک شخص منذر بن کر اٹھا) ظاہر ہے کہ یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی مقسم علیہ محذوف ہے۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں وہ ساری بات محذوف مانی جا سکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہو گی کہ یہ واضح کتاب، جو اپنے دعوے پر خود حجت قاطع ہے، اس بات کی شاہد ہے کہ یہ جھٹلانے والوں کو جس انجام بد سے ڈرا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے، جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے اس کو خبطی یا دیوانہ نہ سمجھو بلکہ وہ ایک رسول مبین ہے، اس کی دعوت تمام تر حکمت پر مبنی ہے۔ اس کو قبول کرنا باعث رحمت اور اس کو رد کرنا باعث نقمت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان باتوں کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے قرآن سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے کے لیے یہ کتاب خود کافی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (۳)

یہ اس اہتمام خاص کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کے لیے فرمایا۔ مقصود اس اہتمام کے ذکر سے مخاطبوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کو کوئی ہنسی مسخری کی چیز یا کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم اسکیم کا ایک نہایت عظیم حصہ ہے اور اس کے اتارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ مبارک شب منتخب فرمائی جو اس کی طرف سے تمام امور حکمت کی تقسیم کے لیے خاص کی ہوئی ہے۔ مقصود اس کے اتارنے سے ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے آبا و اجداد کو انذار

نہیں کیا گیا تھا تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن وہ یہ عذر نہ کرسکیں کہ ان کو انذار کے بغیر ہی پکڑ لیا گیا۔ اس اہتمام خاص کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ جن اور سورۂ قدر کی تفسیر میں آئے گی۔

لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ سے مراد ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر ہے۔ چنانچہ سورۂ قدر میں یہ تصریح موجود ہے کہ اسی رات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۱-۵) (ہم نے اس کو اتارا ہے لیلۃ القدر میں۔ اور تم کیا سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا ہے! لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ملائکہ اور جبریل اترتے ہیں، ہر باب میں اپنے رب کے اذن کے ساتھ۔ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے۔ وہ طلوعِ فجر تک ہے)۔

یہ لیلۃ القدر لازماً رمضان شریف ہی کی کوئی رات ہو سکتی ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ رمضان ہی کے مہینہ میں قرآن نازل ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ..... (البقرۃ: ۱۸۵) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)۔

رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی رات ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ روایات کی روشنی میں صرف اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرہ کی کوئی رات ہے۔ تعیین کے ساتھ اس کے ظاہر نہ کرنے میں مصلحت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بندے اس کی جستجو کریں اور اس طرح ان کے ذوق و شوق اور طلب و تمنا کا امتحان ہو۔ بندوں کی اس طلب و تمنا کے اندر ہی اس لیلۃ القدر کی تمام برکتوں کا راز مضمر ہے۔

ان تصریحات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اس سے شعبان یا کسی اور مہینہ کی کوئی رات مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی شب میں اتار دیا گیا ہو بلکہ یہ اس کے مبارک آغاز کا پتا دیا گیا ہے۔ جب ایک کام کا آغاز ایک مبارک ساعت میں ہو گیا اور اس کے پورے کیے جانے کا فیصلہ بھی ہو گیا تو گویا وہ کام اسی مبارک ساعت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی دوسرا تبدیل نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس اسلوبِ تعبیر کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں پورے ہونے والے وعدے ماضی کے صیغے سے بیان کیے ہیں۔

لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ خاص خاص دنوں، مہینوں اور اوقات کا مبارک

ہونا ان کی روحانی زرخیزی اور فیض بخشی کے پہلو سے ہے۔ جس طرح ہماری اس مادی دنیا میں موسموں اور فصلوں کا لحاظ ہے، ہر موسم ہر چیز کی کاشت کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی ساعات، اوقات، سالوں اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ جو عبادت اللہ تعالیٰ نے جس وقت یا جس دن اور جس مہینہ کے ساتھ وابستہ کر دی ہے اس کی حقیقی برکت اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب وہ اس وقت، یا اس دن یا اس مہینہ کی پابندی کے ساتھ کی جائے۔ ورنہ جس طرح بے موسم کی بوئی ہوئی گندم بے حاصل رہتی ہے اسی طرح بے وقت کی نماز، بے وقت کے روزے اور بے موسم کے حج کا بھی کچھ حاصل نہیں اور اگر ہے تو بہت تھوڑا۔ ہمارے چوبیس گھنٹوں کے اوقات میں فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات روحانی اعتبار سے اپنے اندر ایک خاص برکت رکھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں ان کی یہ برکت واضح فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح ہفتہ کے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روحانی فیض بخشی کے اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے جو کسی دوسرے دن کو حاصل نہیں ——— سال کے بارہ مہینوں میں سے رمضان یا حج کے مہینوں کو جو شرف خصوصی حاصل ہے اس میں دوسرے مہینے ان کے شریک و سہیم نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں سے ایک رات اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر دی ہے جس میں وہ اپنے ملائکہ مقربین کے ذریعہ سے اس دنیا میں مامور ملائکہ کو اپنے سال بھر کے پروگرام سے آگاہ فرماتا ہے کہ وہ ہر حکم کو اس کے مقررہ وقت پر نافذ کریں۔ اسی طرح کی ایک رات میں ربّ العزت نے قرآن نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو انذار کیا جائے اور اس دنیا کی ہدایت کے لیے ایک آخری رسول کی بعثت کی شکل میں جو رحمت مقدر تھی وہ ظہور میں آئے۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس قرآن کا نزول نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے، نہ یہ کوئی بے وقت کی راگنی ہے، نہ یہ بے موسم کا کوئی خودرَو پودا ہے، نہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے بلکہ یہ اس اسکیم کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے پسند فرمائی ہے۔ چنانچہ اس مبارک رات میں اس کو اس نے اتارا ہے جو تمام امورِ حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے۔ پس جن لوگوں کے لیے یہ اتاری گئی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے شایانِ شان اس کی قدر کریں اور یہ یاد رکھیں کہ جو چیز اللہ نے اس شان و اہتمام کے ساتھ اتاری ہے اس کی ناقدری وہ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ کوئی ہوائی چیز نہیں ہے کہ یہ اس کو مذاق میں اڑا دیں اور یہ اڑ جائے۔ اس کی تصدیق یا تکذیب دونوں ہی چیزیں نہایت اہم نتائج کی حامل ہیں اور یہ نتائج لازماً سامنے آکے رہیں گے۔

ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت

'اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ' یہ قرآن کے مقصدِ نزول کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات رہی ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کو ان کی نافرمانیوں پر ہلاک کرنے سے پہلے ان کو تمام خیر و شر سے آگاہ کر

دیا گیا اسی طرح اہل عرب کو بھی ان کی نافرمانیوں پر سزا دینے سے پہلے اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ ان میں سے جو ہدایت قبول کرنا چاہیں وہ ہدایت قبول کر لیں اور جو ہدایت نہ قبول کریں ان کے لیے کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا نزول اور اس رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اتمامِ حجت کے بعد کسی قوم کو مہلت نہیں ملا کرتی اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ جو قدم اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک فیصلہ کن مرحلہ اس کے سامنے ہے۔ اس کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے —— ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت!!

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴)

مخاطبوں کو ایک تنبیہ

یہ اسی شبِ مبارک کی تعریف ہے کہ اس میں تمام مبنی بر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس آیت کو اگر سورۂ قدر کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کو زمین سے متعلق تمام امورِ کلیہ سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ ان سے زمین میں مامور ملائکہ کو آگاہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے نقشہ کے مطابق اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

'اَمْر' کے ساتھ 'حَکِیْم' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر کسی قوم پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ مخاطبوں کو تنبیہ ہے کہ اس وقت جو مرحلہ تمھارے سامنے ہے اس کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کرو۔ اگر تم نے لا ابالیانہ روش اختیار کیے رکھی اور خدا کی ایک مبنی بر حکمت اسکیم کے تقاضے پورے نہ کیے تو اس کے نتائج خود تمھارے حق میں نہایت مہلک ہوں گے۔

أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (۵)

'اَمْرًا' کا نصب علی سبیل الاختصاص ہے اور مقصود اس سے اس تقسیم امور کی اہمیت و عظمت کو واضح فرمانا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خاص امرِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل نہیں ہوتا اس وجہ سے بندوں پر واجب ہے کہ اس کو کائنات کے بادشاہ حقیقی کے خاص فرمان کی حیثیت سے قبول کریں اور سچے جذبۂ انقیاد کے ساتھ اس کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ اگر انھوں نے اس کو رد کیا، اس کا مذاق اڑایا اور اس کی تکذیب کی تو یاد رکھیں کہ یہ اس کائنات کے بادشاہ حقیقی سے بغاوت ہوگی جس کی سزا بڑی ہی ہولناک ہے۔

ان آیتوں کا تعلق اوپر والی آیات سے

'اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ' یہ بالکل 'اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ' کے ہم وزن جملہ ہے جس طرح اوپر والی آیت میں قرآن کے نزول کا مقصد انذار بتایا ہے اسی طرح اس آیت میں یہ حقیقت واضح فرماتی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات پہلے سے طے تھی کہ وہ بنی اسماعیل میں ایک رسول مبعوث فرمائے گا جو بنی اسماعیل کے لیے بھی باعثِ رحمت ہوگا اور تمام خلق کے لیے بھی۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام سے منقول ہیں اور جن کا حوالہ ان کے محل میں ہم دے چکے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس رسول کی بعثت اسی اسکیم کے تحت ہوئی ہے اور ٹھیک اس رات میں ہوئی ہے جو اس طرح کے امورِ مہمّہ کے ظہور کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶)

آنحضرت صلعم کے رحمت ہونے کی طرف اشارہ

یہ ارسالِ رسول کا مقصد واضح فرمایا اور خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ تمھارے رب نے تم کو اپنی جانب سے ایک عظیم رحمت کے طور پر مبعوث فرمایا ہے۔ اگر لوگوں نے تمھاری قدر نہ کی تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنے ہی کو اللہ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کریں گے۔ آیت ۳ میں رسول کے منذر ہونے کا ذکر تھا، اس آیت میں اس کے رحمت و بشارت ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اور یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جو چیز سب سے بڑی رحمت ہوگی وہ سب سے بڑی نقمت بھی بن سکتی ہے اگر اس کی قدر نہ کی جائے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ انذار کے پہلو کو مقدم رکھا ہے درآنحالیکہ قرآن کے نزول اور رسول کی بعثت سے اصل مقصود خلق پر رحمت ہوتا ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف، سورہ کے عمود پر تقریر کرتے ہوئے، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا اصل مزاج انذار ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سمیع و علیم کا لازمی تقاضا

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ: ان صفات کے حوالہ میں ایک پہلو یہ ملحوظ ہے کہ اس کائنات کا رب ایک دانا و بینا ہستی ہے، وہ اپنی خلق کو شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے دانا و بینا ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ خلق کے حالات پر پوری نظر رکھے۔ لوگوں کو اپنے احکام و اوامر سے آگاہ کرے۔ اگر وہ ان کی تعمیل کریں تو دنیا و آخرت، دونوں میں اس کا انعام دے اور اگر سرکشی کریں تو اس کی سزا دے۔ دوسرا یہ کہ اس وقت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے ساتھ قریش کے لیڈر جو کچھ کر رہے ہیں خدائے سمیع و علیم اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے اور جب ہر بات اس کے علم میں ہے اور کوئی چیز بھی اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے تو نبی اور اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ جو کچھ اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا وہ لازماً ظہور میں آئے گا۔ کوئی چیز بھی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔

ان آیات کے مقدرات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ قصص کی آیات ۴۵-۴۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ (۷)

مخالفین کو ایک سخت وعید

یہ مخالفین کو وعید اور بڑی ہی سخت وعید ہے۔ فرمایا کہ اس انذار و تبشیر کو محض ہوائی بات نہ سمجھو جو محض تم پر دھونس جمانے کے لیے کہی جا رہی ہو بلکہ یہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کے خداوند کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی ہر چیز کا مالک اور خداوند ہے تو کس کے امکان میں ہے کہ اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ اگر وہ لوگوں کو پکڑنا چاہے تو جب چاہے پکڑے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو کچھ بخشنا چاہے تو جو چاہے بخش دے کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ: یہ مخاطبوں کو ملامت ہے کہ ہے تو یہ حقیقت بالکل بدیہی لیکن کسی چیز کے ماننے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ بالکل واضح اور بدیہی ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اس کے ماننے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر یہ ارادہ کسی کے اندر موجود نہ ہو تو بدیہی سے بدیہی حقیقت کا بھی وہ انکار کر بیٹھتا ہے اور کوئی بڑے سے بڑا منطقی بھی اس کو قائل کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ (۸)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس کی سفارش تمہارے کچھ کام آسکے۔ زندگی اور موت سب اسی کے اختیار میں ہے۔ وہی تمہارا بھی رب ہے اور وہی تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب ہے۔ اگر تمہارے آباء و اجداد نے اس کے سوا کسی اور کو پوجا تو یہ ان کی سفاہت و جہالت ہے۔ ان کی تقلید کو اپنے لیے دلیل نہ بناؤ ورنہ پرلے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ یَّلْعَبُوْنَ (۹)

انکار کی اصل علت

یعنی یہ انذار و تبشیر ہے تو ایک امر واقعہ جس میں کسی ذی ہوش کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام ہیں کہ جب تک اس چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وقت تک ماننے والے نہیں ہیں، اس وجہ سے شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے اور اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ زندگی کے معاملات میں جن لوگوں کی روش لا ابالیانہ ہے ان کو قائل کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ لوگ اس وقت قائل ہوں گے جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لیں گے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ۙ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۰-۱۱)

ان کے لیے اس دن کا انتظار کرو جس دن آسمان ہر ایک کو نظر آنے والے دھوئیں کے ساتھ نمودار

ہوگا جو سب پر چھا جائے گا اور وہ زبانِ حال سے اعلان کرے گا کہ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔

یہ اس عذاب کی دھمکی ہے جس کا لوگ مطالبہ کر رہے تھے اور جس کو دیکھے بغیر نبی کے انذار کی تصدیق کے لیے تیار نہیں تھے۔

'دخانِ مبین' سے کیا مراد ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دُخَانٍ مُّبِيْنٍ سے کیا مراد ہے؟ دخان کے معنی دھوئیں کے ہیں اور اس کے ساتھ 'مبین' کی صفت کا واضح مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دھواں ایسا ہوگا کہ ہر کہ و مہ اور ہر چھوٹے بڑے کو بالکل نمایاں نظر آئے گا۔ کسی کے لیے بھی اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔

مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دھواں ظہورِ قیامت کے وقت ظاہر ہوگا۔ اس کی تائید میں انھوں نے ایک روایت بھی نقل کی ہے لیکن ناقدینِ حدیث نے اس روایت کو قصہ گویوں کی روایت قرار دے کر اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت آیات کے سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ سیاقِ کلام صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ذکر قیامت کا نہیں بلکہ کسی ایسے عذاب کا ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کی قوموں پر آیا ہے، جس کی تفصیلات عاد، ثمود اور قومِ شعیب وغیرہ کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں۔

ایک دوسرے گروہ نے اس سے ایک قحط مراد لیا ہے جو ان کے بیان کے مطابق، ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجہ میں قریش پر آیا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے اور بھوک سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ آسمان کی طرف لوگ نظر اٹھاتے تو وہ بالکل دھواں ہی دھواں نظر آتا۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے لیکن مجھے اس میں کئی باتیں کھٹکتی ہیں۔

اول یہ کہ اپنی پوری قوم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طرح کی بددعا کا ذکر صرف اس تفسیری روایت ہی میں ملتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور شہادت اس کی موجود نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنی قوم کے لیے بددعا فرمائی ہو۔ آپ کی دعا اپنی قوم کے لیے ہمیشہ یہی رہی کہ 'رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' (اے میرے رب، میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ لوگ جانتے نہیں) سب سے زیادہ نازک موقع ہجرت کا تھا۔ ہجرت کے موقع پر بعض دوسرے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کے لیے بددعا کی بھی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس موقع پر بھی کوئی بددعا کا کلمہ نہیں نکلا۔ آپ نے فرمایا تو بس یہ فرمایا کہ 'اے مکہ! تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن کیا کروں، تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے'۔ مختلف جنگوں کے مواقع پر بھی، جب کہ قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوتی ہیں، آپ نے جو دعائیں کی ہیں وہ تمام تر اہلِ ایمان کے لیے ثباتِ قدم اور حق کے لیے نصرت کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ دشمنوں کے خلاف کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے نکلا ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان

کے دلوں میں اللہ رعب ڈال دے اور ان کے قدموں کو متزلزل کر دے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان مواقع پر بھی کبھی اپنی پوری قوم کے لیے آپ نے بدعا فرمائی ہو۔

دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد سب سے زیادہ نازک موقع حدیبیہ کا موقع ہے جب قریش کی عصبیت جاہلیت بالکل عریاں ہو کر سامنے آئی اور مسلمانوں کے جذبات ان کے خلاف آخری حد تک مشتعل ہو گئے۔ لیکن اس موقع پر بھی آپؐ نے قریش کے لیے کوئی بددعا نہیں کی۔ صرف یہی نہیں کہ بددعا نہیں کی بلکہ مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو دبایا اور ان کو جنگ سے روک دیا اور قرآن نے جیسا کہ سورۂ فتح میں تفصیل آئے گی، اس جنگ کو روک دینے کی حکمت یہ واضح فرمائی کہ جنگ ہوتی تو اندیشہ تھا کہ اس سے ان لوگوں کو نقصان پہنچتا جو دل سے مسلمان تھے لیکن اپنی مجبوریوں کے باعث ابھی مکہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ غور کیجیے کہ جب مکہ کے ان مخفی مسلمانوں ہی کے خیال سے مسلمانوں نے اپنی کھینچی ہوئی تلواریں میانوں میں کر لیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کر لیا جو صحابہؓ کے عام جذبات کے خلاف تھا تو انہی اہل مکہ کے لیے کسی ایسے قحط کی بددعا آپ کیسے کر سکتے تھے جس میں لوگ مردار کھانے تک پر مجبور ہو جائیں؟ اس قسم کا کوئی قحط نمودار ہوتا تو اس کی زد میں مکہ اور طائف کے سردار ہی تو نہ آتے! اس کا اصلی حملہ تو غربا اور عوام پر ہوتا جن کے اندر ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔

تیسری یہ کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ کسی دعا کی ہدایت کی گئی ہے نہ کسی بددعا کی، بلکہ صبر کے ساتھ ایک ایسے دن کے انتظار کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس دن آسمان ایک ایسے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہو گا جو پوری قوم پر چھا جائے گا اور جو زبانِ حال سے یہ منادی کرے گا کہ یہ ہی دردناک عذاب ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا لیکن لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ گویا اس کی نوعیت ایک وعید کی ہے اور وعید حالات کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ قرآن میں قریش کو بار بار اس طرح کے عذاب سے ڈرایا گیا جس طرح کے عذاب، عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ شعیب وغیرہ پر آئے لیکن اس قسم کا کوئی عذاب ان پر نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی اکثریت ایمان لائی۔ صرف تھوڑے سے اشرار اپنی شرارت پر اڑے رہے جو یا تو اہل ایمان کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے یا فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔

چوتھی یہ کہ قحط کی تعبیر 'دخان مبین' سے کوئی موزوں تعبیر نہیں ہے۔ قحط کا مضمون عربی شاعری کا ایک پامال مضمون ہے۔ جس زمانے میں شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں ملک میں ایک قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی۔ بعض علاقوں میں حالات نہایت سنگین بھی ہو جاتے۔ عرب شعرا اپنے قصائد میں ان حالات کی نہایت مؤثر تصویر کھینچتے ہیں اور مختلف استعارات، کنایات اور تشبیہات سے پورے حالات نگاہوں کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی شاعر نے بھی کسی شدید سے شدید

قحط کو بھی 'دخان مبین' سے تعبیر کیا ہو یا اس کے اثر کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب بیان اختیار کیا ہو۔

ان وجوہ سے قحط والی روایت اگر صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق اس آیت سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قحط پڑا ہو، یہ بھی امکان ہے کہ یہ قحط بہت سخت ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی رہی ہے کہ رسولوں کی بعثت کے دور میں ان کی قومیں ایسی آزمائشوں میں ڈالی گئی ہیں جس سے ان کے اندر تنبّہ اور انابت پیدا ہو۔ اس سنت کے اشارات قرآن میں موجود ہیں۔ ان تمام امکانات کے باوجود اس آیت کا تعلق کسی ایسے قحط سے نہیں معلوم ہوتا جس کی شدت سے ہر شخص کا یہ حال ہو گیا کہ اس کو آسمان دھوئیں کی شکل میں نظر آنے لگا۔

'دخان مبین' کی تعبیر سے ذہن اگر منتقل ہوتا ہے تو قحط کی طرف نہیں بلکہ 'حاصب' کے عذاب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ عرب کی پچھلی قوموں پر رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں بیشتر یہی عذاب آیا ہے۔ عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ کی جو سرگزشتیں پیچھے گزر چکی ہیں ان میں اس عذاب کی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام اور قرآن سے اس کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ 'دخان مبین' کی تعبیر سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ سیاہ غبار کا ایک ستون سا آسمان کی طرف اٹھتا نظر آتا ہے۔ اس غبار میں جب تک سورج بالکل چھپ نہیں جاتا اس کی شعاعیں بھی اس کے اندر مخلوط ہوتی ہیں جس سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے جس کا دھواں آسمان تک اٹھ رہا ہے۔ پھر جب ہوا کا زور بڑھتا ہے اور یہ طوفان کسی طرف کا رخ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابر سیاہ چھا رہا ہے جو بس برسنے والا ہی ہے۔ پھر یہ ایک ہولناک شکل اختیار کر لیتا ہے اور بستیوں کی بستیوں کو ریت اور کنکر پتھر کی بارش سے ڈھانک دیتا ہے۔

قوم عاد پر جب عذاب آیا تو انھوں نے فضا کے سیاہ غبار کو ابر سیاہ خیال کیا۔ چنانچہ سورۂ احقاف میں ان کا ذکر یوں آیا ہے: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴) (پس جب انھوں نے اس عذاب کو ایک ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ نہیں بلکہ یہ وہی عذاب ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی۔ ایک باد تند، جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے)۔ اسی عذاب کو قوم شعیب کی تباہی کے ذکر میں 'عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ' سے تعبیر فرمایا گیا: فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ .... (الشعراء: ۱۸۹) (پس انھوں نے اس کی تکذیب کی جس کے نتیجہ میں ان کو یوم ظلہ کے عذاب نے پکڑ لیا)۔ ظلۃ، چھتری اور سائبان اور شامیانے وغیرہ کے لیے بھی آتا ہے اور ابر کے لیے بھی۔

'حاصب' کا عذاب اپنے ابتدائی مرحلہ میں اٹھتے ہوئے ابر یا دھوئیں ہی کی شکل میں نظر آتا ہے

اس وجہ سے قرینِ قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسی عذاب کی دھمکی ہو۔ یہ دھمکی نہایت واضح الفاظ میں قریش کو عاد اور ثمود وغیرہ قوموں کی سرگزشتیں سنا کر دی بھی گئی تھی۔ ہم نہایت وضاحت کے ساتھ پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ان قوموں کے عذاب کی نوعیت واضح کر چکے ہیں۔ آگے کی سورتوں کی تفسیر میں بھی یہ تفصیلات آئیں گی۔ وہاں ہم استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی اس باب میں ان شاء اللہ پیش کریں گے۔

یہ دھمکی، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ مخالفین اگر رسول کی تکذیب کر دیں گے تو ان پر عذاب آجائے گا لیکن مشرکین قریش کی اکثریت، جیسا کہ معلوم ہے آہستہ آہستہ مسلمان ہوگئی اور صلح حدیبیہ کے بعد تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بالتدریج معاندین کا زور بالکل ٹوٹ گیا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر: ۲) کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اس کی صداقت کا مشاہدہ ہر شخص نے اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جو دھمکی تکذیب کی شرط کے ساتھ مشروط تھی اس تصدیق کے بعد اس کے ظہور میں آنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہی چنانچہ قریش بحیثیت مجموعی اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ صرف ان کے وہ اشرار مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آئے جو ان پر حملہ آور ہوئے اور جو تلواروں سے بچ رہے انھوں نے فتح مکہ کے بعد گھٹنے ٹیک دیے۔

يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱)

یہ اس عذاب کی شدت کی تعبیر ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح چھا لے گا کہ کسی کے لیے بھی اس سے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یہ زبانِ حال یا صورتِ حال کی تعبیر ہے کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ کوئی وقتی جھونکا نہیں ہے جو آیا اور گزر گیا بلکہ قہر الٰہی ہے جو سب کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (۱۲)

مشاہدۂ عذاب کے بعد مغروروں کا حال

یعنی اس وقت تو یہ بہت اکڑ رہے اور بڑے طنطنہ سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی لپیٹ میں آجائیں گے تو فریاد کریں گے کہ اے رب! اس عذاب سے نجات دے۔ اب ہم ایمان لائے۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۱۳-۱۴)

یہ وہ جواب ہے جو ان لوگوں کو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ فرمایا کہ عذاب آجانے کے بعد قبولِ نصیحت کا کہاں موقع باقی رہے گا! بالخصوص جبکہ ان کے پاس اتمامِ حجت کے لیے

اللہ نے اپنا ایک رسول بھی بھیج دیا تھا جس نے ہر بات کی اچھی طرح وضاحت کر دی تھی لیکن انھوں نے نہایت تلخی کے ساتھ اس سے منہ موڑا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ یہ دوسروں کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے جس کو عذاب و قیامت کا مالیخولیا ہو گیا ہے۔ اب توبہ کا وقت گزر چکا۔ توبہ کا وقت وہ تھا جب رسول توبہ کی منادی کر رہا تھا۔ وہ وقت انھوں نے کھو دیا تو اب وہ ان کے لیے واپس آنے والا نہیں ہے۔

اس قسم کا جواب، عذاب کی گرفت میں آجانے والے متکبرین کے لیے جگہ جگہ نقل ہوا ہے۔ بعض متکبرین کو یہ جواب مخاطب کر کے دیا گیا ہے۔ مثلاً فرعون کو خطاب کر کے فرمایا: آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (یونس: ۹۱) (اب ایمان لائے! اس سے پہلے تو تم نے نافرمانی کی) دوسرے مقام میں ہے: وَيَقُولُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُوْنُوْا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (ابراہیم: ۴۴) (تو عذاب کی گرفت میں آجانے کے بعد وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پکاریں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے، ہم تیری دعوت قبول اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اس وقت ان کو جواب ملے گا کہ کیا تم لوگ اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تم کبھی اپنے موقف سے ہٹنے والے نہیں ہو!) آیت زیر بحث میں یہی بات ان سے منہ پھیر کر غائبانہ اسلوب میں فرمائی گئی ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلیاں بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہیں اور اہل ذوق کے لیے یہ چیزیں محتاج وضاحت نہیں ہیں۔ خطاب کے اسلوب میں شدت اور غائب کے اسلوب میں اعراض کا مضمون نمایاں ہوتا ہے۔

قرآن اور پیغمبر سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے قریش کا ایک شغلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کا یہ الزام کہ آپ کو بعض دوسرے لوگ سکھاتے ہیں، اور یہ ان کی سکھائی ہوئی باتیں وحی کے دعوے کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، بعض دوسرے مقامات میں بھی مذکور ہے۔ یہ الزام قریش نے محض ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا جو قرآن کے مواد بحث و استدلال سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگ گئے تھے کہ اس قسم کا پر مغز کلام کوئی امی، غیبی رہنمائی کے بغیر، نہیں پیش کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن سے بدگمان کرنے کے لیے قریش نے یہ شغلہ ایجاد کیا کہ یہ کلام کسی وحی و الہام کا ثمرہ نہیں بلکہ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ در پردہ یہ کلام ایجاد کرتے ہیں اور یہ شخص اس کو وحی کے نام سے پیش کرتا ہے۔ مقصود سازش کرنے والوں کا یہ ہے کہ اس راہ سے وہ ہماری قوم میں تفرقہ پیدا کریں۔ یہ الزام لگاتے ہوئے وہ یہ بھی تاثر دیتے کہ اس سازش میں بعض اہل کتاب اور عجمی بھی شامل ہیں تاکہ اس طرح وہ قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عربوں کے قومی جذبات کو کامیابی کے ساتھ بھڑکا سکیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی اصل وجہ کی طرف اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش محسوس کرتے تھے کہ اول تو آپؐ کے دل پر خوفِ عذابِ آخرت کا ایسا غلبہ ہے کہ آپؐ اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اسی کی یاد دہانی کرتے ہیں، دوسرے آپ کے لب و لہجہ میں ایسا اذعان و یقین ہے کہ ہر شخص اس سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر یہ شخص اللہ کی طرف سے مامور نہ ہوتا تو اس کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کے غم میں اپنا خواب و خور حرام کر لیتا؟ لوگوں کے اس تاثر کو دور کرنے کے لیے قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جس طرح بعض لوگوں کو بعض چیزوں کا سودا ہو جایا کرتا ہے، وہ اٹھتے بیٹھتے اسی چیز کی رٹ لگائے رہتے ہیں اور ہر جگہ ان کو وہی چیز نظر آتی ہے، اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا سودا ہو گیا ہے۔ ہر گوشے سے اس کو وہی آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک خبط و جنون ہے۔ بھلا عذاب ہم پر کدھر سے اور کیوں آجائے گا!

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ (۱۵)

جو خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں ان کا توبہ عارضی ہوتی ہے

یعنی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری اس درخواست پر کہ ہم سے عذاب ٹال دیا جائے ہم ایمان لانے والے بن جائیں گے، کچھ وقت کے لیے عذاب ہٹا دیں لیکن تم پھر اسی راہ پر چلو گے جس پر عذاب سے پہلے چلتے رہے ہو۔ اپنی خواہشوں کے غلاموں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو ناک رگڑ رگڑ کے توبہ کرتے ہیں لیکن جب آزمائش گزر جاتی ہے تو اس طرح چل دیتے ہیں گویا نہ کوئی بات پیش آئی، نہ انھوں نے کوئی قول و قرار کیا اور نہ آئندہ اب اس طرح کی بات پیش آئے گی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۱۶)

یعنی اس دنیا میں پکڑ سے چھوٹ بھی گئے تو یہ چیز وجہ اطمینان نہیں ہونی چاہیے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے۔ 'بڑی پکڑ' سے مراد قیامت کی پکڑ ہے۔ اس دنیا میں قوموں کی جو گرفت ہوتی ہے وہ قیامت کے مقابل میں بہرحال چھوٹی ہی ہوتی ہے۔ قیامت کی پکڑ ابدی اور دائمی ہوگی اور اس دن تمام مجرموں سے اللہ تعالیٰ پورا پورا انتقام لے گا۔

۲- آگے کا مضمون ——— آیات: ۱۷-۳۳

آگے اس بات کی تاریخی دلیل پیش کی گئی ہے جو اوپر کے پیرے میں بیان فرمائی گئی ہے۔ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا اتنا حصہ بالاجمال سنا دیا گیا ہے جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فرعون نے خدا کے رسول کے ساتھ جو چال چلی تھی وہی چال قریش کے فراعنہ بھی خدا کے رسول کے ساتھ چل رہے ہیں۔ فرعونیوں کو اللہ نے ان کی چالوں کی سزا دی

اور ان کا سارا غرور پامال ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷-۳۳

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿١٧﴾ أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٨﴾ وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿١٩﴾ وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ﴿٢١﴾ فَدَعَا رَبَّهُ أَنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُجْرِمُونَ ﴿٢٢﴾ فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبَعُونَ ﴿٢٣﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُغْرَقُونَ ﴿٢٤﴾ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٢٥﴾ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٢٦﴾ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ﴿٢٧﴾ كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿٢٨﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٢﴾ وَآتَيْنَاهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُبِينٌ ﴿٣٣﴾

الثلثة

ع ۲۹ / ۱۴

ترجمہ آیات ۱۷-۳۳

اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کو آزمایا اور ان کے پاس ایک باعزت رسول آیا۔ اس پیغام کے ساتھ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو، میں تمہارے لیے ایک معتمد رسول ہوں اور یہ کہ تم خدا کے مقابل میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے ایک واضح حجت پیش کرتا ہوں۔ اور میں نے اپنے اور تمہارے خداوند کی پناہ مانگی

اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اور اگر تم میری تصدیق نہیں کرتے تو میری راہ چھوڑو۔ ۱۷-۲۱

پس اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ یہ مجرم ہیں۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج بنیں گے۔ ۲۲-۲۴

انھوں نے کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے اور سامان عیش، جس میں وہ مگن رہتے تھے، چھوڑے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ پس نہ ان پر آسمان نے آنسو بہائے اور نہ زمین ہی نے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہی بنے۔ ۲۵-۲۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی۔ یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ بڑا ہی سرکش، حدود سے نکل جانے والا تھا۔ اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر ترجیح دی جان بوجھ کر اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ ۳۰-۳۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (۱۷)

قریش اور قوم فرعون کی مشابہت

قریش اور قوم فرعون کے حالات میں مشابہت کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح کے امتحان میں ہم نے قریش کو ڈالا ہے اسی طرح کے امتحان میں ہم نے اس سے پہلے قوم فرعون کو بھی ڈالا تھا۔ جس طرح ان کو سامانِ عیش و رفاہیت کی فراوانی حاصل ہوئی اسی طرح ان کو بھی دولت و نعمت کی کثرت عطا ہوئی تھی۔ پھر جس طرح

ان کی طرف ایک معزز رسول انذار اور اتمام حجت کے لیے آیا اسی طرح ان کی طرف بھی ایک باعزت رسول آیا ہے۔ اس مشابہت کے حوالہ سے مقصود ظاہر ہے کہ یہ دکھانا ہے کہ جو انجام ان کا ہوا، وہی انجام لازماً ان کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کو جو دولت و شوکت حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان کے لیے ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دے کر یہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی یہ نعمتیں پاکر قومیں اس کی شکرگزاری اور بندگی کی راہ پر چلتی ہیں یا سرکشی اور طغیان کی راہ اختیار کرلیتی ہیں۔ اگر وہ یہ دوسری راہ اختیار کرلیتی ہیں تو مہلت کی ایک مدت ان کو ملتی ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کا نام و نشان مٹا دیتا ہے۔

عزت و شرف منصب رسالت کا خاصہ ہے

'رَسُوْلٌ' کے ساتھ 'کَرِیْمٌ' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول چونکہ بادشاہ کائنات کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کے پاس آتا ہے اس وجہ سے عزت و شرف اس کے اس منصب کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ اس کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ امیر ہے یا غریب اور نہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے شاہی خاندان سے ہے یا بنی اسرائیل کے غریب خاندان سے جن کو فرعونی غلام اور ذلیل سمجھتے تھے۔ اس کا اصلی وصف یہ ہے کہ وہ خدا کا سفیر ہے اور جو خدا کا سفیر ہے اس سے معزز خدا کے سوا نہ کوئی اور ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۱۸)

اللہ کے بندوں کو کوئی اپنا بندہ نہیں بنا سکتا

'اَنْ' سے پہلے حرف جر محذوف ہے یعنی باعزت رسول اس پیغام کے ساتھ ان کے پاس آیا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' (طٰہٰ: ۴۷) کے الفاظ سے نقل ہوئی ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ اس فقرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مطالبہ کی دلیل بھی سمو دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے اس وجہ سے ان کو میرے ساتھ جانے دو تاکہ ہم اپنے رب کی بندگی جس طرح کرنی چاہتے ہیں بغیر کسی روک ٹوک کے کر سکیں۔ یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے اس تفسیر میں جگہ جگہ زیر بحث آچکا ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنی بات واضح ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی بندگی کی پوری آزادی چاہتے تھے۔ فرعون کے لیے یہ حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنائے رکھے۔

ایک مخفی تہدید

'اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ'۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو اطمینان دلایا کہ میں کوئی مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ فی الواقع خدا کا رسول ہوں۔ پوری امانت و دیانت کے ساتھ تم کو وہی پیغام پہنچا رہا ہوں جو خدا نے دے کر مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے یہ بات، مجرد اپنی صفائی میں نہیں فرمائی بلکہ اس کے اندر ایک تہدید بھی مخفی ہے کہ اگر مجھے مفتری قرار دے کر میری تکذیب کی گئی تو اس کے نتائج نہایت مہلک ہوں گے۔ جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ ان لوگوں سے ضرور انتقام لے گا۔

وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۹)

رسول سے بغاوت خدا سے بغاوت ہے

یہ اسی پیغام کا حصہ ہے کہ مجھے یہ پیغام پہنچانے کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کے اس حکم کو سیدھے سیدھے مان لو۔ اگر تم نے سرکشی کی تو یہ سرکشی صرف میرے ہی مقابلہ میں نہیں ہو گی بلکہ یہ اصلاً خدا کے مقابل میں ہوگی اس لیے کہ میری اصل حیثیت یہ ہے کہ میں خدا کا سفیر ہوں۔

'اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ'۔ 'سلطان مبین'۔ سے اشارہ عصا اور ید بیضاء کے معجزات کی طرف ہے یعنی میں سفیر الٰہی ہونے کی اپنے پاس نہایت واضح سند رکھتا ہوں اور وہ میں تمھیں دکھاتا ہوں تاکہ میرے باب میں تمھیں کوئی شک باقی نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک نہایت سرکش اور جبار بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کو ایسے معجزات سے مسلح فرما دیا تھا جو ان کے مخالفوں پر حجت ہو سکیں۔

وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۲۰)

ایک بلیغ دعوت اور موثر تنبیہ

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت فرمائی ہے جب ان کے مطالبہ نے تمام قبطیوں میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ اس وقت ان کو قتل کی دھمکی بھی دی گئی اور یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ سرپھری قوم بوکھلا کر آپ کو سنگسار ہی نہ کر دے۔ اس وقت آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے سنگسار کرنے کا نیت رکھتے ہو تو میں اپنے کو اس رب کی پناہ میں دیتا ہوں جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ 'وَرَبِّكُمْ' (اور تمھارا بھی رب ہے) کے الفاظ میں ایک مؤثر اپیل بھی ہے، نہایت بلیغ دعوت بھی ہے اور نہایت پرزور تنبیہ بھی اور ساتھ ہی اس میں یہ طنز بھی مخفی ہے کہ اس خناس کے کہے میں آ کر جو تمھارا 'رب اعلیٰ' بنا ہوا بیٹھا ہے کوئی ایسی حرکت نہ کر گزرنا جو تمھاری ساری قوم کا بیڑا ہی غرق کر دے۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (۲۱)

یعنی اگر تم لوگ یہ باور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو کہ میں خدا کا سفیر ہوں تو کم از کم مجھے قتل یا سنگسار کرنے کے مجرم نہ بنو بلکہ میری راہ چھوڑ دو۔ میں بنی اسرائیل کو لے کر جہاں جانا چاہتا ہوں چلا جاؤں۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم میری بات باور کرتے اور مجھ پر ایمان لاتے۔ یہ چیز تمھاری دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت کی ضامن ہوتی۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو کم از کم میری راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش نہ کرو۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ (۲۲)

حضرت موسیٰؑ کی فریاد اپنے رب سے

قبطیوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس اپیل اور تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ بدستور اپنی سازشوں اور سرگرمیوں میں لگے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے فریاد کی، 'اے رب، یہ لوگ سننے اور ماننے والے نہیں ہیں بلکہ یہ پکے مجرم ہیں، تو ہی ہے جو ان کے چنگل سے رہائی دلا سکتا ہے۔'

فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۲۳)

فریاد کی فوراً شنوائی ہوئی

یہ فریاد بالکل بر وقت تھی اس وجہ سے فوراً شنوائی ہوئی۔ قبولیت کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے یہاں کوئی ایسا لفظ لانا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ دعا کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت ہوئی۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر یہاں سے راتوں رات نکل جاؤ اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی کہ فرعونیوں کی طرف سے تمہارا تعاقب ہو گا۔ اس انتباہ کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ فرعون نے اگرچہ ان آفتوں سے تنگ آ کر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں کے نتیجہ میں مصر پر نازل ہوئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند دن کے لیے جانے کی اجازت دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری قوم سمیت روانہ ہوئے تو اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اپنی اور اپنے تمام علاقائی سرداروں کی فوجیں لے کر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا کہ ان کو مجبور کر کے پھر واپس لائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پیش آنے والی صورتِ حال سے پہلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ کوچ و قیام میں کوئی غیر ضروری تاخیر پیش نہ آئے بلکہ وہ مقررہ پروگرام کے مطابق دریا کو عبور کرنے کی کوشش کریں۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۲۴)

حضرت موسیٰؑ کو ہدایت

'رَهْو' کے معنی ساکن کے ہیں یعنی تم اس ہوا کے رکنے سے پہلے پہلے دریا سے نکل جاؤ جس ہوا کے ذریعہ سے پانی کو قدرت ہٹائے اور تمہارے لیے راستہ صاف کرے گی۔ تمہارے نکلتے ہی دریا پر سکون ہو جائے گا اور ہٹا ہوا پانی پھر اپنی جگہ گھیر لے گا۔ اس دوران میں مصری تمہارے تعاقب میں دریا کے بیچ میں ہوں گے۔ اور پانی ان پر اس طرح چھا جائے گا کہ وہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (۲۵-۲۷)

عیش و عشرت کے سامان کی بے وقعتی

یعنی جن باغوں اور چشموں، کھیتوں اور پر شوکت کوٹھیوں اور عیش کے سامانوں نے ان کو اتنا متکبر

میں مبتلا کیا، ان سے محروم ہو کر وہ سمندر کی موجوں کا لقمہ بنے۔ ان کا گمان تھا کہ یہ چیزیں ان کی کامیابی اور ترقی کی دلیل ہیں اور جو لوگ ان کو تباہی سے ڈراتے ہیں وہ بالکل بے خرد ہیں۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ خدا کے خوف کے بغیر یہ چیزیں تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جب تباہی آتی ہے تو ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی۔

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۸)

مجرموں کے لیے سنت الٰہی

'كَذٰلِكَ' کے بعد نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں، یعنی ہم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی آئندہ بھی کریں گے۔ 'وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ' اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ 'دوسروں' سے مراد یہاں بنی اسرائیل نہیں ہیں۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کا مصر آنا ثابت نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد پڑوس کی وہ قومیں ہوں جن سے فرعونیوں کو برابر اندیشہ رہا کہ مبادا وہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ ملا کر ملک پر قبضہ کر لیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی جو اسکیم چلائی گئی تھی اس کا محرک ان کا یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر بنی اسرائیل کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ ان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۲۹)

یعنی جب تک وہ اقتدار میں رہے اس وقت تک، تو سمجھتے رہے کہ وہ ایک عظیم تمدن کے بانی ہیں اور ساری دنیا ہمیشہ ان کی کنوڈی رہے گی لیکن ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین ہی نے دو آنسو بہائے بلکہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا کہ خس کم جہان پاک!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ایک مظلوم کی موت پر تو آسمان بھی کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور زمین بھی فریاد کرتی ہے۔ تورات میں لکھا ہے کہ خداوند نے فرمایا کہ زمین سے مجھے ہابیل کا خون پکارتا ہے۔ لیکن ظالموں اور نافرمانوں کی بربادی پر آسمان اور زمین سب خوش ہوتے ہیں، خاص طور پر ان نافرمانوں کی تباہی پر جن پر اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی ہو۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۳۰-۳۱)

'مِنْ فِرْعَوْنَ' بدل ہے 'الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ' سے۔ گویا اللہ نے خود فرعون کو ایک عذاب ذلت سے تعبیر فرمایا۔ فرعون تو حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک خود فرعون نہ صرف ذلیل بلکہ ایک عذاب رسوائی تھا۔

'اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اسے ایک رسوا کن

عذاب سے تعبیر کیا گیا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ وہ نہایت سرکش اور اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر جانے والوں میں سے تھا۔ جو لوگ اللہ کے آگے سرکشی کرتے ہیں وہ مظلوموں کے لیے عذاب اور عنداللہ ذلیل ہوتے ہیں۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۳۲)

جو قوم شریعت کی حامل ہوتی ہے وہی خلق کی رہنمائی کی اہل ہوتی ہے

یعنی فرعون اور اس کی قوم کو تو ہم نے غرق دریا کیا اور بنی اسرائیل کو، جو ان کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہے تھے، اہل عالم کی رہنمائی کے لیے انتخاب کیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جو قوم خدا کی شریعت کی حامل بنائی جاتی ہے فطری طور پر وہی اہل اور حقدار ہوتی ہے اس بات کی کہ وہ خلق کی رہنمائی کرے۔ اس کا یہ منصب مشروط ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی منصبی ذمہ داری پوری دیانت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر وہ یہ ذمہ داری ادا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے یہ منصب، چھین کر دوسروں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ ایک خاص دور میں بنی اسرائیل کو یہ منصب حاصل ہوا لیکن جب وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ معزول کر دیے گئے اور ہدایتِ خلق کی ذمہ داری ملتِ مسلمہ کے سپرد ہوئی۔

تاریخ کا ایک فلسفہ

'عَلٰى عِلْمٍ' کے الفاظ سے تاریخ کے اس فلسفہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کا عزل و نصب اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو منتخب کرتا ہے اور جس کو نااہل پاتا ہے اس کو رد کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو معزول ہوتے ہیں وہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنی نالائقی پر سر پیٹیں اور جو اقتدار پر آئے وہ فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے خدا کے شکرگزار ہوں اور اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس دنیا کے عروج و زوال کا سارا نقشہ اللہ تعالیٰ مرتب کرتا ہے اور اس کی بنیاد تمام تر قوموں کے اخلاق و کردار پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بے خطا اور اس کی حکمت بے لاگ ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک اہم تنبیہ

ان آیات کے اندر بنی اسرائیل کے لیے، جو ان آیات کے زمانۂ نزول میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کمر کس رہے تھے، نہایت اہم تنبیہ ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ہی نکتہ سمجھ گئے ہوتے کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر کیا تھا اور اب اس کے علم ہی کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ اس انجام بد سے بچ جاتے جو اسلام کی مخالفت کے نتیجہ میں ان کے سامنے آیا۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (۳۳)

بنی اسرائیل کا امتحان انعامات کے ذریعہ سے

'بَلٰٓؤٌا' کے اصل معنی تو امتحان اور جانچ کے ہیں لیکن امتحان نعمت کے ذریعے سے بھی ہوتا ہے اور مصیبت کے ذریعے سے بھی۔ نعمت کا امتحان شکر کی جانچ کے لیے ہوتا ہے اور مصیبت کا امتحان صبر کی جانچ کے لیے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ نعمت اور انعام کے مفہوم میں آیا ہے جس طرح الانفال آیت ۱۷ کے

ہیں۔ بَلٰٓـؤٌا کا لفظ حَسَنًا کی صفت کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اشارہ ان انعامات کی طرف ہے جو سمندر سے پار کراتے ہوئے اور اس کے بعد صحرا کی زندگی میں اور فتح فلسطین اور اس کے بعد کے ادوار میں اللہ تعالیٰ نے گوناگوں شکلوں میں بنی اسرائیل پر فرمائے۔ جن کی تفصیلات، سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۳۴ - ۵۷

آگے کی آیات میں قریش کی سرکشی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے اپنے حاضر میں مگن اور مستقبل سے بے فکر ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے پہلے قانونِ جزاء و سزا کے عقلی و فطری دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اہلِ کفر و اہلِ ایمان دونوں کے انجام کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۴-۵۷

إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ لَيَقُولُونَ ﴿٣٤﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا ٱلْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ﴿٣٥﴾ فَأْتُوا۟ بِـَٔابَآئِنَآ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٣٦﴾ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَٰهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ مُجْرِمِينَ ﴿٣٧﴾ وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَٰعِبِينَ ﴿٣٨﴾ مَا خَلَقْنَٰهُمَآ إِلَّا بِٱلْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّ يَوْمَ ٱلْفَصْلِ مِيقَٰتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٠﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِى مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْـًٔا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤١﴾ إِلَّا مَن رَّحِمَ ٱللَّهُ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٤٢﴾

ع ۲ / ۱۳ / ۱۵

إِنَّ شَجَرَتَ ٱلزَّقُّومِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ ٱلْأَثِيمِ ﴿٤٤﴾ كَٱلْمُهْلِ يَغْلِى فِى ٱلْبُطُونِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْىِ ٱلْحَمِيمِ ﴿٤٦﴾ خُذُوهُ فَٱعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَآءِ ٱلْجَحِيمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوا۟ فَوْقَ رَأْسِهِۦ مِنْ عَذَابِ ٱلْحَمِيمِ ﴿٤٨﴾ ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾ إِنَّ هَٰذَا

مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾

ع ۳ / ۷ / ۱۶

ترجمہ آیات ۴۴-۵۷

یہ لوگ بڑے جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ بس یہ ہماری پہلی موت ہی ہے اور ہم اس کے بعد زندہ نہیں کیے جائیں گے تو لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ ۳۶-۳۴

کیا یہ بہتر حالت میں ہیں یا قوم تبع کے لوگ۔ اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔ ۳۷

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک غایت کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ بے شک فیصلہ کا دن ان سب کا وقت موعود ہے جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو سکے گی۔ ہاں مگر وہ جن پر اللہ رحم فرمائے۔ بے شک وہی عزیز و رحیم ہے۔ ۴۲-۳۸

زقوم کا درخت گنہگاروں کا کھانا ہوگا، تیل کے تلچھٹ کے مانند پیٹ میں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ اس کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر پر گرم پانی کا عذاب بہاؤ۔ چکھو اس کو تم بڑے مقتدر اور

باعزت بنے رہے! یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم شک میں پڑے رہے! ۴۳-۵۰

ہاں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے وہ مقامِ امن میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں۔ وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ خدا سے ڈرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا! اور ہم ان سے بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں۔ وہ اس میں طلب کریں گے ہر قسم کے میوے، نہایت چین سے۔ وہ اس میں پہلی موت کے بعد پھر موت سے آشنا نہیں ہوں گے اور اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ یہ خاص تیرے رب کے فضل سے ہوگا۔ یہی ہے درحقیقت بڑی کامیابی! ۵۱-۵۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ (۴۴-۳۵)

کفار کا زعم

یعنی یہ لوگ بڑے عزم و جزم کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ قیامت وغیرہ کا ڈراوا محض ایک ہوا ہے۔ بس یہی موت، جس سے اس دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے، یہی اول موت بھی ہے اور یہی آخری بھی۔ اس کے بعد نہ کوئی موت ہے، نہ کوئی زندگی۔

فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶)

کفار کی واحد بے بنیاد دلیل

اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ اہل ایمان سے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر موت کے بعد زندگی ہے تو تمہاری سچائی ہم اس وقت تسلیم کریں گے جب تم ہمارے وفات پائے ہوئے بزرگوں میں سے کسی کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ یہی مضمون سورۂ جاثیہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (الجاثیۃ: ۲۵) (اور جب ان کو موت کے بعد کی زندگی کے حق میں، ہماری روشن دلیلیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو واحد دلیل جو وہ اس کے مقابل میں پیش کرتے ہیں وہ ان کا یہ قول ہوتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھاؤ) قرآن نے اس دلیل کو ان کی واحد دلیل قرار دیا ہے اور اس کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، کوئی تردید اس کی نہیں کی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی واحد دلیل، جس پر ان کو بڑا ناز ہے یہ ہے۔ اس کی لغویت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۳۷)

"قَوْمُ تُبَّعٍ" سے مراد تبابعہ یمن ہیں جن کی مادی شوکت و عظمت اور ذہنی صلاحیتوں کی عرب میں بڑی شہرت رہی ہے۔ عرب شعراء ان کی عظمت کا چرچا بہت کرتے ہیں۔

قوموں پر جب خدا کا عذاب آتا ہے تو وہ اپنے ہی اسلحہ سے خودکشی کرتی ہیں

قرآن نے قریش کے مذکورہ بالا مطالبہ کے جواب میں ان سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ بتائیں کہ مادی شان و شوکت اور ذہنی و عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ برتر ہیں یا تبابعہ برتر تھے؟ اگر وہ برتر تھے اور اس برتری کے باوجود خدا نے ان کو تباہ کر دیا، نہ ان کی مادی قوت و صولت ہی خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکی نہ ان کی ذہانت ہی ان کے کچھ کام آئی تو آخر یہ کس بل بوتے پر اس غرے میں مبتلا ہیں کہ کوئی ان کو ہلا نہیں سکتا؟ جب خدا نے ان سے زیادہ زور آوروں کی گردن توڑ دی تو ان کی گردن کیوں نہیں توڑ سکتا؟ یہی حال ان سے پہلے کی دوسری قوموں کا بھی ہوا۔ عاد و ثمود وغیرہ اور بعض دوسری قومیں ہر اعتبار سے ان سے برتر تھیں لیکن جب انھوں نے خدا سے سرکشی کی تو خدا نے ان کا نام و نشان مٹا دیا تو آخر ان کے لیے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ یہ خدا کے چہیتے بنے رہیں گے اگرچہ سرکشی میں ان سے بھی چار قدم آگے نکل جائیں؟ خدا کی میزان میں وزن قوموں کے اخلاق و کردار کا ہے، ان کی مادی دولت و ثروت اور ان کی شاندار عمارتوں کا نہیں ہے اور نہ ان کے میزائلوں اور ایٹم بموں کا ہے۔ جب قوموں کا کردار فاسد ہو جاتا ہے تو ان کے انہی بموں کو، جو وہ دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے بناتی ہیں خدا انہی کے سروں پر دے مارتا ہے اور وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اسلحہ سے خودکشی پر مجبور ہوتی ہیں۔

دنیا میں قوموں کو سزا ملنا آخرت کے عذاب کی دلیل ہے

دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کی مثالیں موجود ہیں اور اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے تو آخر ایک ایسے روزِ جزا و سزا کے بارے میں کیوں شک کیا جائے جس میں خالقِ کائنات افراد کو بھی اسی طرح جزا یا سزا دے جس طرح اس نے دنیا میں قوموں کو جزا یا سزا دی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۸-۳۹)

آخرت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

اوپر جزاء و سزا کی دلیل تاریخ اور آفاق کے آثار و شواہد سے پیش کی گئی ہے۔ اب یہ خدا کی صفات اور ان کے اخلاقی و عقلی تقاضوں سے اس پر دلیل لائی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے بلکہ ایک برتر غایت اور ایک مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس مقصدِ حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو اور اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس میں

اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نافرمانی کی ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے، نہ اس کے نیکوں کو کوئی انعام ملے نہ بدوں کو کوئی سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا خالق، نعوذ باللہ، کوئی کھلنڈرا ہے جو آسمانوں پر بیٹھا ہوا ظلم و مظلومی کا تماشہ دیکھ رہا ہے اور جب اس کا جی اس تماشے سے بھر جائے گا تو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا یا یوں ہی یہ تماشہ جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال اس کائنات کے حکیم و رحیم خالق سے متعلق ایک ایسا سوءِ ظن ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثریت اس میں مبتلا ہے اور لوگ اس کے نتائج سے بالکل بے خبر ہیں۔

اس خیال کی گمراہیوں پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِیۡقَاتُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (۴۰)

اس کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اس کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی نتیجہ مذکور ہوا ہے کہ یہ بات خدا کے علم، عدل اور اس کی حکمت و رحمت کے بالکل منافی ہے کہ یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے بلکہ ضرور ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس دن خدا عدل کی کرسی پر بیٹھے اور ہر ایک کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ جنھوں نے حق و راستی کی زندگی بسر کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ظلم و تعدی کا ارتکاب کیا ہو وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور وہ دن عدل کامل کے ظہور کا دن ہو کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے۔ چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، شاہ اور گدا سب کا انصاف ہو اور ایسا انصاف ہو کہ نہ کوئی حقیقت مخفی رہ جائے اور نہ کوئی کسی پہلو سے انصاف میں مزاحم ہو سکے۔ یہاں لفظ 'اَجۡمَعِیۡنَ' پر خاص طور سے نظر رہے۔

یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ مَوۡلًی عَنۡ مَّوۡلًی شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۴۱)

لفظ 'مَوۡلًی' خاندان اور قبیلہ کے ان افراد کے لیے آتا ہے جن کے ساتھ آدمی کا خون اور نسب کا رشتہ اور جن میں باہم عصبیت کا جذبہ ہو۔ فرمایا کہ وہ دن ایسا نفسی نفسی کا ہو گا کہ کوئی عزیز و قریب کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ 'وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ' اور نہ ان کی کسی اور ہی طرف سے کوئی مدد کی جائے گی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مدد کی نفی ہے جو مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء سے رکھتے تھے۔

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ (۴۲)

اللہ کی رحمت کے حق دار

یعنی اس دن فائز المرامی صرف انہی کا حصہ ہو گی جن پر خدا اپنا فضل فرمائے اور اس کا فضل انہی پر ہو گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ اللہ عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ وہ جن کو پکڑے گا کوئی ان کو چھڑا نہ سکے گا۔ اور جن کو وہ اپنی رحمت کا مستحق پائے گا کوئی ان کو اس کی رحمت سے محروم نہیں

کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ بندوں کو ڈرنا بھی اسی سے چاہیے اور رحمت کی امید بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ (۴۳-۴۶)

مجرموں کا حشر

اوپر یوم الفصل کا جو ذکر آیا ہے اس کے فیصلوں کے نتیجہ میں گنہگاروں کا جو حشر ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ تھوہر کا درخت گنہگاروں کی غذا بنے گا۔ یہ تھوہر دوزخ کا تھوہر ہے اس وجہ سے اس کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ہم اس دنیا کے تھوہر سے بس اس کا ایک ہلکا سا تصور ہی کر سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

لفظ 'مُھل' کے مختلف معنی لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ اشتقاق کے پہلو کو سامنے رکھ کر میں نے تیل کے تلچھٹ کے معنی کو ترجیح دی ہے۔ فرمایا کہ یہ تھوہر ان گنہگاروں کے معدہ میں جا کر اس طرح کھولے گا جس طرح تیل کا تلچھٹ کھولتا ہے۔ اور اس طرح جوش مارے گا جس طرح پانی جوش مارتا ہے۔

یعنی اس کا کھولنا حدت، شدت، جلن اور تلخی میں تو نہایت مکروہ اور گدلے تیل کے تلچھٹ کے مانند ہوگا اور جوش کے اعتبار سے پانی کے کھولنے کے مانند۔ تیل پکتا ہے تو اس میں حدت تو نہایت شدید ہوتی ہے لیکن جوش نہیں ہوتا، پانی پکتا ہے تو اس میں جوش بھی ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ میں کھولنے کی دونوں صفتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ (۴۷-۴۸)

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ و بتقاضائے بلاغت محذوف ہے کہ ان لوگوں کے باب میں بارگاہ خداوندی سے یہ حکم ہوگا۔ اس کے بجائے اصل حکم کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے وارڈروں کو ہدایت ہوگی کہ ان کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ میں لے جاؤ اور وہاں گرم پانی کے عذاب کے ڈونگڑے ان پر برساؤ۔

ذُقْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ (۴۹-۵۰)

یہ قول عذاب کی زبانِ حال سے بھی ہو سکتا ہے اور عذاب دینے والوں کی زبانِ قال سے بھی۔ ایک ایک سے یہ کہا جائے گا کہ تم دنیا میں بڑے مقتدر اور عزت والے بنے رہے اور اس گھمنڈ میں تم نے اس دن کی پیشی کو جھٹلایا۔ آج اس کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ۝ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۵۱-۵۲)

خدا ترسوں کا صلہ

گنہگاروں کے انجام کے بیان کے بعد یہ خدا ترسوں کے انجام کی تصویر ہے کہ وہ ایک مقام مامون میں

ہوں گے، نہ وہاں ان کو کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔ وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور اس بات کا ان کو کوئی اندیشہ نہیں ہوگا کہ ان چیزوں کو کوئی ان سے چھین سکے گا یا ان پر کوئی زوال آئے گا یا ان میں سے کسی چیز کے باب میں ان سے کوئی پرسش ہونی ہے۔

يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۵۳)

'سُنْدُس' اور 'اِسْتَبْرَق' ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے۔ لیکن یہ ذکر جنت کے 'سُندس' اور 'اِستبرق' کا ہے اس وجہ سے یہ بحث غیر ضروری ہے۔ ان کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

'تقابل' کے معنی یہاں آمنے سامنے بیٹھنے کے ہیں۔ تالیف کلام کے پہلو سے یہاں فعل 'یَجْلِسُوْنَ' یا 'یَتَّکِـُٔوْنَ' محذوف ماننا پڑے گا۔ یعنی وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی دلیل ہے چونکہ انھوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو نیک مشورے دیے اور اس کا نہایت مبارک انجام ان کے سامنے ہوگا اس وجہ سے وہ پوری خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کے بیٹھیں گے۔ اس کے برعکس کفار اور ان کے لیڈر اس دن ایک دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائیں گے۔

كَذٰلِكَ ۗ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ (۵۴-۵۵)

فرمایا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ہم آہو چشم حوریں ان کی زوجیت میں دے دیں گے۔ عربی ادب میں عورت کے لیے یہ صفت اس کے کمال حسن کی ایک جامع تعبیر ہے۔

'یَدْعُوْنَ فِیْهَا ...... الآیۃ'۔ ان کے لیے ہر قسم کے میووں کی بہتات ہوگی وہ جو میوے چاہیں گے حاضر باش خدّام سے طلب کریں گے۔ نہ ان کو میووں کی کمی کا کوئی اندیشہ ہوگا۔ نہ اس عیش سے محرومی کا کوئی خوف ہوگا اور نہ موت ہی کا کوئی کھٹکا ہوگا۔ ہر اندیشہ سے نچنت وہ ابدی عیش کا لطف اٹھائیں گے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۵۶-۵۷)

یعنی اس دنیا میں جو موت انھوں نے چکھ لی اس کے بعد پھر وہ موت سے آشنا نہیں ہوں گے۔ ان کی زندگی بھی جاوداں ہوگی اور ان کا عیش بھی۔ موت سے انھوں نے چھٹکارا پایا اور دوزخ سے ان کے رب نے ان کو بچایا۔ یہ خاص فضل ہے جو تیرے رب نے ان پر فرمایا اور یہی درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر اس دنیا کے پرستار ریجھے ہوئے ہیں اور اس کے عشق میں ایسے کھوئے گئے ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ یہی دنیا کی زندگی بس کُل زندگی ہے، اس کے بعد نہ جینا ہے نہ مرنا۔

۶- خاتمۂ سورہ ـــــ آیات: ۵۸-۵۹

یاد ہوگا اس سورہ کا آغاز قرآن کی عظمت کے بیان سے ہوا تھا کہ بڑی ہی عظیم نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو نوازا ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کریں گے تو دنیا اور آخرت دونوں میں فوزِ عظیم کے وارث ہوں گے۔ اور اگر گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس کی ناقدری کریں گے تو یاد رکھیں کہ یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی نقمت بھی بن جائے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان کریں گے۔ اس تمہیدی مضمون کے بعد قرآن کے دعاوی کی صداقت کے دلائل مذکور ہوئے۔ اب آخر میں ایک نئے پہلو سے پھر اسی مضمون کی یاددہانی فرما دی گئی جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ گویا سورہ اسی مضمون پر ختم ہوئی جس سے شروع ہوئی تھی۔ اس اسلوب کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس اسلوب کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔ خطیب جس مضمون سے کلام کا آغاز کرتا ہے بالعموم اسی کی یاددہانی پر اس کو ختم کرتا ہے تاکہ آخر میں سامعین کو اصل بات کی مکرر یاددہانی ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات: ۵۸-۵۹

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾

ع ۳ / ۱۷ / ۱۶

ترجمۂ آیات: ۵۸-۵۹

پس ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ تو تم بھی انتظار کرو، وہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔ ۵۸-۵۹

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۵۸)

'فَ' سابق کے ساتھ مضمون کے اتصال کو ظاہر کرتا ہے اور اتصال کا پہلو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

قرآن کی تیسیر کا مفہوم

'تَيْسِيْر' کے معنی کسی شے کو کسی مقصد کے لیے موزوں، سازگار اور ہر پہلو سے مستحکم و استوار بنانا ہے۔ 'یسر الفرس للرکوب' کے معنی ہوں گے گھوڑے کو زین، رکاب، لگام اور دوسرے تمام لوازم سے آراستہ کر کے سواری کے لائق بنا دیا۔ اسی طرح 'یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' کے معنی ہوں گے 'قرآن کو تعلیم و تذکیر کے مقصد کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے نہایت موزوں بنایا ہے، جن

لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قرآن ایک نہایت سہل اور سپاٹ کتاب ہے۔ انھوں نے اس لفظ کی اصل حقیقت نہیں سمجھی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نہایت سہل کتاب بھی ہے لیکن اس کی یہ سہولت اس اعلیٰ مقصد تعلیم و تذکیر کے اعتبار سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی ہے۔ یہ مقصد اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتا ہے اور قرآن چونکہ اس کے تمام پہلوؤں اور ان کے تمام ضروری لوازم کا جامع ہے اس وجہ سے اس کے اندر نہایت دقیق اور مشکل پہلو بھی ہیں اگرچہ ان مشکل پہلوؤں کو دلوں کے اندر اتارنے کے لیے قرآن نے جو طریقے اختیار کیے ہیں ان سے زیادہ دل نشین طریقے اختیار کرنا دوسروں کے امکان میں نہیں ہے۔ تاہم یہ چیزیں بجائے خود نہایت گہرے تدبر کی محتاج ہیں اس لیے کہ ان کا تعلق حکمت سے ہے اور حکمت گہرے تدبر کی مقتضی ہوتی ہے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی طرف سورۂ مریم کی آیت ۹۷ کے تحت بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں اور خدا نے چاہا تو اس پر مزید روشنی سورۂ قمر کی تفسیر میں ڈالیں گے۔

'بِلِسَانِکَ' سے مراد قریش کی وہ ٹکسالی زبان ہے جو فصیح عربیت کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کی فصاحت و بلاغت کے مظہر اتم تھے۔ یہ قرآن کی تیسیر کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قریش پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں اتارا ہے جو قریش کی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر اس زبان میں بھی یہ اس کتاب کو نہ سمجھے تو نہ اس کتاب کا قصور ہے اور نہ تمھارا بلکہ یہ خود ان کے دلوں کا فساد ہے جس کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔

'لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ' یہ قرآن کے اس اہتمام خاص کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ 'یاددہانی حاصل کریں' یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کی عقل و فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس کو یاد کریں، جو حقائق آفاق و انفس کے اندر مضمر ہیں ان سے سبق حاصل کریں اور جو تعلیم ان کو سابق نبیوں، خاص کر ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے ملی ہے اس کو یاد کریں۔ قرآن ان ساری باتوں کی نہایت بہترین زبان اور بہترین اسلوب سے یاددہانی کر رہا ہے۔ اس ٹکڑے کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ اگر وہ یہ یاددہانی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر اس انجام کے لیے تیار ہو جائیں جو اس طرح کے سرکش لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے اور جس کی یاددہانی خود ان کے ملک کی پچھلی تاریخ ان کو کر رہی ہے۔

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ (۵۹)

اس آیت میں اوپر والی مضمر تنبیہ واضح ہو کر سامنے آگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ منتظر ہیں کہ جس عذاب سے یہ ان کو ڈرا رہی ہے اس کو دیکھ کر ہی اس کو مانیں گے تو تم بھی انہی کی طرح اب اس عذاب ہی کا انتظار کرو۔ اب فیصلہ کا انحصار اسی پر ہے۔ اوپر آیت ۱۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد

۲۲ مئی ۱۹۷۶ء — ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ